تعلیق 15[1]

"الجماعۃ" کا مفہوم

نصوص اور آثار میں "الجماعۃ" کا اطلاق کئی ایک مفہوم پر ہوا ہے۔ نہ صرف شرع میں؛ بلکہ لغت اور عرف میں بھی؛ دستور ہے کہ کسی سماجی اکائی کو متعدد جہتوں سے بیان کر لیا جائے۔ مثال کے طور پر جب آپ لفظ "مغرب" ہی بولیں تو اس سے مراد کسی وقت مغربی اقوام ہوں گی۔ کسی وقت مغربی حکومتوں یا مغربی قیادتوں کو ہی 'مغرب' کہہ دیا جائے گا۔ کسی وقت مغرب کے نظریات یا مغرب کی تہذیب یا دستور کی بابت بولا جائے گا کہ 'مغرب یوں کرتا یا مغرب یوں کہتا' ہے۔ علیٰ ھٰذا القیاس۔

چنانچہ "الجماعۃ" سے ہماری مراد ہوتی ہے:

مسلمانوں کی وہ مجتمع حالت جس میں: وہ کافر ملکوں، ملتوں، تہذیبوں اور اجتماعیتوں سے الگ تھلگ وہ سماجی وسیاسی اکائی ہوتے ہیں؛ جس میں دین اسلام اپنا عملی ظہور کرتا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: وَالْمُرَادُ بِالْجَمَاعَةِ جَمَاعَةُ الْمُسْلِمِينَ "الجماعۃ سے مراد ہوتی ہے جماعۃ المسلمین" (فتح الباری ج 2 ص 202)۔ آگے چل کر کہتے ہیں: "اِس معنیٰ میں "الجماعۃ" سے نکلنے کا مطلب ہوگا مرتد ہونا"۔ (حدیث: التاركُ لدينه، المفارق الجماعة)۔

وجہ یہ کہ "الجماعۃ" کوئی جغرافیائی قوم نہیں بلکہ ایک نظریاتی (ایک خاص عقیدہ سے وجود میں آنے والی) قوم ہے۔ پس جو حیثیت دوسری قوموں کے ہاں جغرافیائی حدوں کو حاصل ہوتی ہے یہاں وہ حیثیت ایمان کو حاصل ہے۔

اہم سوال یہ ہے کہ "مرتد ہو جانے" ایسی ایک ہی حقیقت کو حدیث میں دو جہتوں سے بیان کیوں کیا گیا: اسے "التاركُ لدينه" کہہ دینے پر اکتفا کیوں نہ کیا، ساتھ میں "المفارقُ الجماعةَ" کیوں کہا؟ معلوم ہوا یہاں ایک نہیں دو چیزیں تھیں جنہیں مرتد چھوڑ گیا ہے: ایک

---

[1] ابن تیمیہ کے متن میں دیکھئے فصل اول، حاشیہ 15

یہ دین اور ایک اس پر قائم جماعت[i]؛ دونوں لازم و ملزوم۔ پس جتنا کوئی شخص یا گروہ اِس ”دین“ پر ہے اتنا وہ اِس ”جماعت“ میں ہے۔ جو مرتد ہوا وہ اس سے بالکل باہر۔ جو بدعت اور فسق میں پڑا وہ جزوی طور پر جماعت میں شامل اور جزوی طور پر جماعت سے منحرف۔ اور جو خالص سنت اور اتباع پر رہا وہ اِس جماعت کا نیوکلئیس nucleus۔ اس دین پر ایک مجتمع اکائی بن کر رہنا فرض ہوا اور اِس (فرض) حالت کا نام ہوا ”جماعت“۔

1. پس ایک معنیٰ میں ”جماعت“ وہ فریم ہے جو اِس اکائی کو ایک ہیئت دے گا۔ یہ اس کی آئینی جہت ہوئی، جسے ہم اپنی اصطلاح میں تشریعی جہت کہیں گے۔
2. دوسرے معنیٰ میں ”جماعت“ ایک وجود ہے جو بذاتِ خود ایک وحدت اور جتھہ بندی سے عبارت ہے۔
3. تیسرے معنیٰ میں ”جماعت“ ایک نظم کا نام ہو گا۔ یہ اس کی انتظامی جہت ہے۔

ائمہ ٔسنت سے ہمیں ”جماعت“ کے یہ تین ہی معانی ملتے ہیں۔ ذیل میں ان کا کچھ بیان کیا جاتا ہے۔

پہلا مفہوم:

الجماعۃ کا مفہوم اپنی تشریعی جہت کے اعتبار سے، آگے تین ذیلی نقاط میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایک: حق پر قائم انسانی وحدت۔ دوسرا: صحابہؓ جو اِس فصل (جماعۃ المسلمین) کا پہلا پُور رہے؛ اور بعد کے پُور اِسی کے مُڈھ سے پھوٹتے رہے۔ تیسرا: اہل شریعت؛ یعنی امت کی علمی قیادتیں۔ یہاں ان تینوں ذیلی مفہومات کی کچھ وضاحت کی جاتی ہے:

1- ”الجماعۃ“ سے مراد: حق پر قائم انسانی وحدت:

ایک نظریاتی قوم ہونے کے حوالے سے چونکہ یہ روئے زمین کی منفرد ترین قوم ہے۔۔ لہٰذا یہاں سے ”الجماعۃ“ کا وہ اہم ترین معنیٰ پھوٹتا ہے، جس کا تعلق اِس قوم کی شریعت، تہذیب، اَخلاق اور معیارات سے ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول کہ ”جماعت وہ ہے جو حق کے موافق ہو، خواہ تم اس پر اکیلے کیوں نہ رہ گئے ہو“ اِسی باب سے ہے۔ ائمہ ٔسنت کے ہاں عموماً

اِس کی یہ شرح کی گئی ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو جماعت کے ہاں “آج تک چلتی آئی” اور جس سے روگردانی اس کے ہاں اصولاً قبول نہیں خواہ بعد کی نسلیں ایک بڑی تعداد میں اس سے ہٹنے کیوں نہ لگ گئی ہوں۔ یعنی ایک چیز کو اس کی اصل پر باقی رکھنا اور اس کو بدل کر کچھ سے کچھ ہو جانے سے بچانا۔ وجہ وہی کہ یہ ایک نظریاتی قوم ہے اور اپنی اُسی قدیمی حقیقت پر رہنا اِس کی ترجیحات میں سرفہرست۔ چنانچہ یہ “الجماعۃ” کی آئینی جہت ہوئی۔ بدعتی ٹولوں کا “الجماعۃ” سے منحرف ہونا اِسی باب سے ہے اگرچہ وہ دین اسلام سے مکمل طور پر خارج نہ بھی ہوں۔ یعنی “الجماعۃ” سے مفارقت کی دو صورتیں ہوئیں: ایک مکمل انحراف یعنی ارتداد۔ دوسرا جزوی انحراف یعنی ایسے نظریاتی یا تہذیبی رویے جو باطل ہیں مگر کفر نہیں ہیں۔ یہاں آپ دیکھتے ہیں بدعات، اھواء اور نئے نئے نظریات اور ان کے داعیوں اور پیروکاروں کے خلاف تحریک اٹھانے میں علمائے عقیدہ کے ہاں انتہا کر دی جاتی ہے۔ کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے نئے نئے نسخے ایجاد کرنے والوں پر شدید تشنیع کی جاتی ہے۔ اُس پرانی حقیقت کو، جو صحابہؓ سے چلی آتی ہے، جاری وساری رکھنے کے لیے پورا زور صرف کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ “الجماعۃ” سے یہ انحراف مہلک ترین ہے۔ أَمَّا بَعدُ فإِنَّ خَیرَ الکَلَامِ کَلامُ اللہِ، وَخَیرَ الْھدیِ ھدیُ مُحَمَّدﷺ۔ و کُلَّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ، وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ، وَالضَّلَالَۃُ فِی النَّار اِس “الجماعۃ” کے دستور کی وہ عظیم شق ہے جس کو بآوازِ بلند دہرائے بغیر اِس کے “الجمعۃ” کا کوئی خطبہ مکمل نہیں ہوتا۔

پس یہ وہ انسانی جماعت ہے جو قیامت تک، ایک خاص ڈھب پر جینا اپنا دستور مانتی اور اس میں کوئی “نیا رخ” آ جانے کو اپنے حق میں ہلاکت جانتی ہے۔ **آسمانی عمل** پر مامور ایک **انسانی جماعت**؛ کہ خود نوعِ انسانی کی بقا اِسی سے وابستہ ہے۔ تاہم انسان ہونے کے ناطے؛ یہ “نئے نئے رخ” اِس کے ہاں بھی آئیں گے ضرور، جو کہ افتراق کا موجب ہے؛ اور افتراق ہلاکت۔ چنانچہ اِس کی وہ حالت ہی جو ایک بدعت یا ایک افتراق کے آ جانے سے پہلے تھی، اِس کی اصل حالت قرار پائی؛ یعنی پرانے دستور پر ہونا۔ اِس کا اجتماع جس چیز پر ہوا تھا وہی اِس کی طبعی حالت ہے۔ پس جہاں کوئی دھڑا “سنت” سے ہٹا وہاں وہ “الجماعۃ” نہ رہا؛ جبکہ باقی ماندہ لوگ “الجماعۃ”۔ اور یہ “الجماعۃ سے وابستگی” کے قوی ترین معانی میں سے ایک ٹھہرا۔

”جماعت“ کے اِس مفہوم پر ہمارے ہاں اتنا زور کیوں دیا گیا؟

- دنیا کی قومیں یا تو سرے سے جغرافیائی اقوام ہیں؛ یعنی محض کسی خطے میں پایا جانا ان کو کوئی ’قوم‘ بنا دیتا ہے۔ جیسے موسم، درجۂ حرارت اور آب و ہوا! یہاں سے اٹھ کر وہاں چلے گئے تو ایک اور قوم بن گئے! غرض جمادات سے ملتی جلتی کوئی چیز۔
- یا پھر نسلی اقوام ہیں؛ جن میں ایک دوام اور ثبات ضرور ہے مگر وہ دوام ان کے خون میں چلتا ہے؛ اور یہ چیز حیوانات کو بھی حاصل ہے۔[2]
- یا پھر کسی عقیدہ یا مذہب سے تشکیل پانے والی اقوام ہیں۔ کسی خاص مذہب و عقیدہ کو اپنی پہچان بنانا ہے ایک انسانی عمل۔ قطع نظر اس سے کہ یہ انسانی عمل آسمانی راہنمائی کا محتاج ہے؛ یہاں کے بیشتر مذہبی گروہ سرے سے کسی ثابت معیَّن حقیقت پر نہیں۔ یہاں؛ ”ثبات“ رکھنا ایک دشوار کام ہے اور ’موسمی اثرات‘ کے ہاتھوں بدلتے چلے جانا پہاڑ سے لڑھکنے جیسا آسان! یہاں عیسائیت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے مگر رہتی پھر بھی ’عیسائیت‘ ہے! ہندومت بے شمار تبدیلیوں سے گزرتا چلا جاتا اور رہتا ’ہندومت‘ ہے! علیٰ ھٰذا القیاس، روحانیات اور انسانیات کے نئے نئے فلسفے ان مذاہب میں ضم ہوتے چلے جاتے ہیں اور ’محسوس‘ تک نہیں ہوتے۔

مگر ”اسلام“ چونکہ آسمان سے اتری ہوئی ایک ثابت معیَّن حقیقت ہے؛ لہٰذا یہاں

---

[2] دستورِ اسلام کی بابت نوٹ کیجئے: انسان کے حیوانی مطالب کو بھی اسلام میں کہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔ انسان کی نسلی یا جغرافیائی انفرادیت کو بھی یہاں ہرگز کچلا نہیں جاتا۔ اس کے برعکس؛ اِن بنیادوں پر سامنے آنے والی اکائیوں کو بھی بہت سا اعتبار بخشا جاتا ہے (سورۃ الحجرات کا ایک مضمون)۔ بس اتنا ہے کہ ان نسلی و جغرافیائی اشیاء کو اُس اصل ”اجتماعیت“ (الجماعۃ) کے تابع کر دیا جاتا ہے جو انسان کے شایانِ شان ہے؛ یعنی خدا اور اُس کے آئین سے وابستگی؛ جس میں کمال وسعت اور آسائش ہے۔

اِس نہایت اہم مضمون پر پیچھے ہم تفصیل سے گفتگو کر آئے (فصل: ”نسلی اکائیاں، علاقائی رہن سہن اور ریاست... ”جماعۃ المسلمین بہ مقابلہ ماڈرن سٹیٹ“ اور اس سے متصل چند فصول)۔ اسلامی ’ہیومن اسٹ‘ اِس مقام پر بہت سے ابہامات پیدا کر کے ”الجماعۃ“ کو ایک فرسودہ تصور ثابت کرتے ہیں۔

"ابتداع innovation" کے راستوں پر پہرے بٹھا دیے جاتے ہیں۔ **پس یہ دنیا کی واحد قوم ہے جس کا اصل مسئلہ اپنی وہ "قدیمی ساخت" برقرار رکھنا ہے**۔ ایک ایسی قوم جو یہاں "زندگی گزارنے" نہیں آئی۔ "زندگی" کے لیے اِس کو بہشت دی گئی ہے؛ یہاں البتہ یہ کسی **مقصد** سے آئی ہے اور یہ **مقصد** پورا کر کے ہی اِس کو وہ بہشت ملنے والی ہے۔ پس یہ "آسمانی جماعت ہونا" اِس کو منفرد کر دیتا ہے۔ جہاں دوسری قوموں کا سب سے بڑا مسئلہ "ہونا" ہے، جس کے بعد اُنہیں خاک میں مل کر خاک ہو جانا ہے.. وہاں قومِ رسولِ ہاشمیؐ کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی ایک معیَّن ساخت رکھنا ہے، جس کی بدولت یہ نعمتِ خُلد کی امیدوار ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ دوسری انسانی جماعتوں کا 'ہونا' ہی اُن کے لیے سب کچھ ہے؛ جہاں حوادث کے تھپیڑے انہیں 'ساخت' دیتے چلے جاتے ہیں۔ جبکہ اِدھر آسمانی نصوص کی ساخت کردہ ایک جماعت؛ جو زمانے کی "ساخت" کرتی ہے۔ كُنْتُمْ خَيرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ یہ وجہ ہے کہ اِس کے ہاں سب سے بڑا طعنہ "آسمانی ہدایت" سے ہٹ کر کہیں سے ہدایت لینا ہے؛ کیونکہ اِس کی ساری جان اُسی ایک چیز میں ہے۔ **چونکہ دوسری قوموں کو ایسی کوئی صورت ہی درپیش نہیں، اور نہ یہ اُن کی شان ہو سکتی ہے؛ لہٰذا "الجماعۃ" کا یہ مفہوم خاص اِسی کے ہاں پایا جاتا ہے**۔ کتبِ عقیدہ عَلَيكُمْ بِالْجَمَاعَةِ کا سب سے قوی مفہوم یہی بیان کرتی ہیں۔

2- "الجماعۃ" سے مراد: صحابہؓ

اِسی سے متصل؛ الجماعۃ کا ایک مفہوم: "اصحابِ رسول اللہ" ہے۔ یعنی اسلامی فصل کا وہ پہلا پور جس سے یہ روئے زمین پر ایک تسلسل کی شکل اختیار کر گئی۔ یا وہ پیمانہ جسے سامنے رکھ کر یہاں ہر نسل کو اپنی جہت درست کرنا ہوتی ہے۔ پس پچھلے بند کے تحت اگر کچھ مجرد abstract معیارات آئے تو اِس بند کے تحت ایک ٹھوس concrete معیار آ گیا۔ امام شاطبیؒ نے کتاب الاعتصام (ج3 ص212) میں "الجماعۃ" کا تیسرا مطلب یہی بیان کیا ہے اور اِس قول کو بطورِ خاص عمر بن عبد العزیزؓ سے منسوب کیا۔ اِسی معنیٰ کے تحت شاطبیؒ مَا أنَا عَلَيهِ وَأصحَابِي کی تفسیر کرتے ہیں: مَا أنَا عَلَيهِ: یعنی "السنۃ"۔ وَأصحَابِي: یعنی

’’الجماعۃ‘‘۔ اور یہاں سے بنا ’’اھل السنۃ والجماعۃ‘‘۔ یعنی وہ لوگ جو اتباع کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی (السنۃ)۔ اور اس اتباع کا معیار اور نمونہ مانتے ہیں صحابہؓ (الجماعۃ) کو۔ اور اِنہی دو بنیادوں ’’السنۃ والجماعۃ‘‘ پر اپنی پوری اجتماعیت استوار رکھتے ہیں۔

غرض وہ پوری ایک نسل جس نے سب سے پہلے دنیا میں ’’الجماعۃ‘‘ ہو کر دکھایا؛ اور وہ بھی براہِ راست آسمانی راہنمائی کے تحت؛ پھر اِس پر آسمان سے باقاعدہ سند پائی؛ اور اپنے بعد قیامت تک آنے والوں کے لیے امام مقرر ہوئی... وہ زمین کی اِس سب سے نظریاتی قوم کے ہاں ایک خصوصی معنیٰ میں ’’الجماعۃ‘‘ مانی جاتی ہے؛ جس کے علمی دستور کی پابندی لازم ہے۔

3- ’’الجماعۃ‘‘ سے مراد: علمائے حل و عقد

اسی سے متصل؛ الجماعۃ کا ایک مفہوم مسلمانوں کی امامت کرانے والی ہستیاں ہیں۔ یہ ’’اولی الامر‘‘ کے تحت بھی بیان ہوئیں۔ کہیں ان کو اہل حل و عقد کہا جاتا ہے اور کہیں علماء وفقہاء۔ غرض امت کا سرکردہ ہدایت یافتہ طبقہ؛ خواہ یہ علمی و نظریاتی پہلوؤں سے مسلمانوں کی کشتی کے کھیون ہار ہوں (جو کہ اہم تر ہے) اور خواہ سیاسی و سماجی و عسکری پہلوؤں سے۔ امت ان کے تابع ہے۔ ’’لزومِ جماعت‘‘ پر بخاری کے ایک باب کا عنوان پیچھے ہم دیکھ آئے؛ جس میں وہ الجماعۃ کی تفسیر ’’اھل العلم‘‘ سے کرتے ہیں۔ اس کی شرح میں ابن حجرؒ کہتے ہیں:

وَالْمُرَادُ بِالْجَمَاعَةِ: أَهْلُ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ مِنْ كُلِّ عَصْرٍ. وَقَالَ الْكِرْمَانِيُّ: مُقْتَضَى الْأَمْرِ بِلُزُومِ الْجَمَاعَةِ أَنَّهُ يَلْزَمُ الْمُكَلَّفُ مُتَابَعَةَ مَا أَجْمَعَ عَلَيْهِ الْمُجْتَهِدُونَ وَهُمُ الْمُرَادُ بِقَوْلِهِ وَهُمْ أَهْلُ الْعِلْمِ. (فتح الباری ج13 ص316)

> الجماعۃ سے مراد ہے ہر دور کے اہل حل و عقد۔[3] کرمانی نے کہا: لزومِ جماعت کا حکم دینے کا مقتضا یہ ہوا کہ آدمی مجتہدین کے اجماع کردہ امور کا پابند رہے۔ امام بخاریؒ کے یہ کہنے سے بھی کہ ’’وہ اہل علم ہیں‘‘، یہی مراد بنتی ہے۔

---

[3] واضح رہے، ایک خاص علمی سیاق میں ’’اہلِ حل و عقد‘‘ اُن کبار علماء کے لیے بولا جاتا ہے جن کے علمی مواقف کی طرف رجوع ہوتا اور اجماع میں ان کا اعتبار ہوتا ہے۔

ترمذیؒ حدیث يَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَة (رقم 2167) دینے کے بعد کہتے ہیں:

وَتَفْسِيرُ الجَمَاعَةِ عِنْدَ أَهْلِ العِلْمِ هُمْ أَهْلُ الفِقْهِ وَالعِلْمِ وَالحَدِيثِ

اہل علم کے ہاں “الجماعۃ” کی تفسیر ہے: فقہ، علم اور حدیث کے رجال۔

الجماعۃ کے پہلے مفہوم پر یہ جو تین بند گزرے، ان پر ابن حبانؒ کی ایک جامع تقریر:

الْأَمْرُ بِالْجَمَاعَةِ بِلَفْظِ الْعُمُومِ، وَالْمُرَادُ مِنْهُ الْخَاصُّ، لِأَنَّ الْجَمَاعَةَ هِيَ إِجْمَاعُ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَمَنْ لَزِمَ مَا كَانُوا عَلَيْهِ وَشَذَّ عَنْ مَنْ بَعْدَهُمْ لَمْ يَكُنْ بِشَاقٍّ لِلْجَمَاعَةِ، وَلَا مُفَارِقٍ لَهَا، وَمَنْ شَذَّ عَنْهُمْ وَتَبِعَ مَنْ بَعْدَهُمْ كَانَ شَاقًّا لِلْجَمَاعَةِ، **وَالْجَمَاعَةُ بَعْدَ الصَّحَابَةِ هُمْ أَقْوَامٌ اجْتَمَعَ فِيهِمُ الدِّينُ وَالْعَقْلُ وَالْعِلْمُ، وَلَزِمُوا تَرْكَ الْهَوَى فِيمَا هُمْ فِيهِ، وَإِنْ قَلَّتْ أَعْدَادُهُمْ، لَا أَوْبَاشُ النَّاسِ وَرِعَاعُهُمْ، وَإِنْ كَثُرُوا**

(صحیح ابن حبان بسلسلہ حدیث: أنا آمركم بخمسٍ، رقم 6233)

“جماعت” کا حکم عموم کے لفظ میں وارد ہوا، مگر مراد اس سے خاص ہے۔ کیونکہ جماعت ہے اصل میں اصحاب رسول اللہ ﷺ کا اجماع۔ پس جو آدمی دستورِ صحابہ کا پابند رہا اور بعد والوں کی اپج سے دور رہا وہ نہ تارکِ جماعت ہے اور نہ مفارقِ جماعت۔ البتہ جو شخص صحابہؓ سے الگ راہ چلا اور بعد والوں کا پیروکار رہا وہ ضرور تارکِ جماعت ہے۔ ہاں صحابہؓ کے بعد وہ لوگ “جماعت” ہوں گے جن میں دین، عقل اور علم جمع ہوں اور وہ اپنے معاملات میں ھوائے نفس سے دور رہنے والے ہوں، اگرچہ تعداد میں تھوڑے ہوں۔ نہ کہ عام آوارہ لوگ، اگرچہ وہ بہت کیوں نہ ہوں۔

خلاصہ یہ کہ: “سنت” (اللہ و رسولؐ کی اطاعت) اور “جماعت” (صحابہؓ اور ان کا دستور) اور اس کے ماہرین (فقہاء و مدبرین) وغیرہ یہاں “جماعت” کے معانی ہی کے اندر گوندھ دیے گئے۔ پس عام قوموں کے برعکس؛ اِس “الجماعۃ” کا نظریاتی وجود اس کے سیاسی وجود پر ہمیشہ فوقیت رکھے گا۔ **اِس کے عقائدی پیراڈائم کو ہر چیز پر برتری حاصل رہے گی۔** روئے زمین کی کسی اور جماعت کو ایسا کوئی معاملہ ہی درپیش نہیں۔ حتیٰ کہ اِس امت کے اہل

بدعت کا یہ مسئلہ نہیں۔ یہ ترجیح اپنی واضح ترین صورت میں صرف اِس امت کے ”اہلِ سنت و جماعت“ کے ہاں پائی جائے گی۔ اِس قاعدہ کا بہت بڑا اثر ”احکامِ ضرورت“ لاگو کرنے کے وقت سامنے آئے گا۔[4]

دوسرا مفہوم:

خود لفظِ ”جماعۃ“ کا مطلب ہے: اجتماع۔ یعنی ایک ہونا۔ اکٹھ۔ یکجہتی۔ ہم آہنگی۔

ابن تیمیہ ”عقیدہ واسطیہ“ میں لکھتے ہیں:

دفعہ 296: وَسُمُّوا أَهْلَ الْجَمَاعَةِ ؛ لِأَنَّ الْجَمَاعَةَ هِيَ الِاجْتِمَاعُ وَضِدُّهَا الْفُرْقَةُ ؛ وَإِنْ كَانَ لَفْظُ الْجَمَاعَةِ قَدْ صَارَ اسْمًا لِنَفْسِ الْقَوْمِ الْمُجْتَمِعِينَ ۔

اور وہ اھل الجماعۃ کہلائے؛ کیونکہ جماعت ہے: اجتماع۔ اور اس کا اُلٹ ہے: فُرقہ (ٹولے ہونا)؛ گو (بعد ازاں) ”جماعت“ ان لوگوں پر ہی بولا جانے لگا جو مجتمع ہوں۔

اِس مفہوم کی رُو سے: ”جماعۃ المسلمین“ کا مطلب ہوگا مسلمانوں کی مجتمع حالت۔ ان کی وحدت۔ اکٹھ۔ شیرازہ بندی۔ جبکہ ”جماعت کو لازم پکڑنے“ کا مطلب: مسلمانوں کی مجتمع حالت کا حصہ بننا۔ ان کے اجتماع کو قائم اور اس میں شامل رہنا۔ ”شناخت“ اور ”وابستگی“ کے دیگر عنوانات مانند نسل، زبان، قوم، ملک، علاقہ، مسلک وغیرہ (جن کا اپنی اپنی جگہ اعتبار بے شک ہے) کو اِس اجتماعیت کے آگے ہیچ رکھنا اور اپنی اِس اصل وابستگی کو ہی اپنے سب امور پر حاوی رکھنا۔ اس الجماعۃ کا جو کوئی نظم اور ڈسپلن ہے پورے اخلاص اور شعور کے ساتھ اس کا پابند رہنا۔ اس کی ترقی و شادمانی اور فتح و کامرانی کے لیے فکرمند اور اس کی وحدت کے لیے سرگرم رہنا۔ یہاں ٹوٹے دلوں کو جوڑنا۔ پھوٹ کو حتی الوسع ختم کرنا۔ تفرقہ و انتشار کے عوامل کو زیادہ سے زیادہ ناکام و غیر مؤثر کرنا۔ فصل کے عین شروع میں دی گئی احادیث عَلَیْکُمْ

---

[4] اِس پر دیکھئے کتاب میں (آگے چل کر آنے والی) دو فصول: ”امراء کے ساتھ صبر اور تعاون، اہل سنت کا امتیازی وصف“ اور ”احکامِ ضرورت میں جماعت کا معنیٰ امارت پر مقدم“۔

بِالْجَمَاعَةِ، وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةِ[5] .. مَنْ أَرَادَ بُحْبُوحَةَ الجَنَّةِ فَلْيَلْزَمُ الجَمَاعَةَ.. الْجَمَاعَةُ رَحْمَةٌ وَالْفُرْقَةُ عَذَابٌ.. فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ يَرْكُض.. يَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَة.. ”جماعت“ کے اِس معنیٰ پر سب سے زیادہ منطبق ہیں۔

”جماعت“ کا یہ دوسرا مفہوم عملاً کئی ایک جہت سے سامنے آتا ہے:

1- ”جماعت“ کا یہ معنیٰ، سماجی جہت سے:

اللہ اور اس کے رسول نے جماعت و یکجہتی کا حکم دیا اور تفرقہ و اختلاف سے ممانعت فرمائی۔ نیکی کے کاموں میں تعاونِ باہمی کا حکم دیا اور برائی کے کاموں میں باہم مددگار ہونے سے منع فرمایا۔ صحیحین میں، ارشادِ نبوی ہے: ”مومنوں کی مثال باہمی الفت، مودت اور عاطفت میں یوں ہے جیسے ایک جسم؛ جس کا ایک عضو تکلیف میں ہو تو پورے جسم میں بخار اور بے آرامی دوڑ اٹھتی ہے“۔ صحیحین میں ہی ارشاد ہوا: ”مومن کی مثال مومن کے ساتھ یوں ہے جیسے ایک مضبوط چنی عمارت، جس کا ایک حصہ دوسرے کی تقویت ہوتا ہے“، اور یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ نے انگلیاں انگلیوں میں ڈال کر (دکھائیں)۔ صحیح حدیث میں فرمایا: ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے؛ نہ وہ اس کو کسی کے حوالے کرتا ہے اور نہ بے یارومددگار چھوڑتا ہے“۔ نیز صحیح حدیث ہے: ”مدد کرو اپنے بھائی کی؛ وہ ظالم ہو تب مظلوم ہو تب“۔ عرض کی گئی: مظلوم ہو تو مدد کروں، ظالم ہو تو مدد کیسے؟ فرمایا: ”اس کو ظلم سے روکو، یہ اُس کی مدد ہے“۔ صحیح حدیث میں، فرمایا: پانچ چیزیں مسلمان پر مسلمان کے لیے واجب ہیں: ملے

---

[5] عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ، وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةِ خود اِس حدیث کا دوسرا جز (وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةِ) پہلے جز (عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ) کی تفسیر کرتا ہے۔ یعنی یکجہتی، ہم آہنگی، مسلمانوں کا ایک وحدت اور سیسہ پلائی قوت ہونا۔ اِس عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ سے ”کئی جماعتوں“ پر استدلال کرنا البتہ درست نہ ہوگا؛ کیونکہ اُس صورت میں لفظ ہونے چاہئیں تھے: عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَات نہ کہ عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ! اِس حدیث میں جس ”جماعت“ کا حکم دیا گیا ”تنظیموں“ کا حالیہ فنامنا اس سے بالکل مختلف ایک چیز ہے۔ یہ تنظیمیں بالکل جائز و مشروع ہیں مگر کچھ دیگر دلائل سے؛ اُن کا معاملہ اِس حدیث کے ساتھ خلط بہرحال نہ ہونا چاہئے۔

تو سلام کرے۔ بیمار پڑے تو عیادت کرے۔ چھینک لے تو اس کے لیے بھلے الفاظ بولے۔ وہ اِس کی دعوت کرے تو یہ قبول کرے۔ وہ مر جائے تو یہ اُس کے جنازے میں چلے“۔ صحیح حدیث میں، فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی مومن نہ ہو گا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے“۔ چنانچہ یہ اور اس مضمون کی دیگر احادیث بیان کرتی ہیں کہ اللہ اور رسول نے مومنوں کے ایک دوسرے پر کیا حقوق فرض کیے ہیں۔ صحیحین میں، فرمایا: ”بچو آپس میں قطع تعلقی سے۔ دشمنی کرنے سے۔ نفرتیں رکھنے سے۔ ایک دوسرے کے خلاف حسد رکھنے سے۔ اور اللہ کے ایسے بندے بنو جو بھائی بھائی ہوتے ہیں“۔ صحیحین میں ہی، فرمایا: ”اللہ کو تمہارے لیے تین باتیں پسند ہیں: یہ کہ تم اس کی عبادت کرو بغیر اس کے کہ اُس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک کرو۔ اور یہ کہ سب مل کر اللہ کی رسی سے چمٹ جاؤ اور آپس میں تفرقہ نہ کرو۔ اور یہ کہ جن لوگوں کو اللہ نے تمہارا حکمران بنایا ہے ان کا وفادار و خیر خواہ رہو“۔ سُنن میں آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے: ”کیا میں تمہیں ایک ایسی نیکی کی خبر نہ دوں جس کا درجہ نماز سے بھی اوپر ہے، روزے سے بھی، صدقہ و زکات سے بھی اور امر بالمعروف و نھی عن المنکر سے بھی“؟ صحابہ نے عرض کی: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول۔ فرمایا: ”آپس کے معاملے کو درست رکھنا۔ یاد رکھو آپس کے معاملہ کا خراب ہونا مونڈ کر رکھ دینے والا ہے۔ یہ بالوں کو نہیں بلکہ دین کو مونڈ کر رکھ دیتا ہے“۔ غرض ایسے ہی امور جن سے اللہ اور اُس کے رسول نے ممانعت فرمائی۔ (مجموع الفتاویٰ ج11 ص92-94)

2- رشتۂ دینی کو ہر حال میں نبھانا، اہل ایمان کے ساتھ موالات قائم رکھنا:

چنانچہ باوجود اس کے کہ سلف کے مابین لڑائی بھی ہو گئی تھی، پھر بھی ان کے مابین دینی موالات قائم رہی تھی۔ یہ آپس میں وہ دشمنی روانہ رکھتے تھے جو کفار کے ساتھ

رکھی جاتی ہے۔[6] یہ ایک دوسرے کی شہادت اور روایت قبول کرتے۔ ایک دوسرے سے علم لیتے۔ ایک دوسری کے وارث بنتے۔ آپس کی شادیاں بیاہ؛ اور وہ بہت سے معاملات جو مسلمانوں کے اپنے آپس میں چلتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ایک دوسرے سے بھڑ جانے اور باہمی طعن و تشنیع تک بھی معاملہ آجاتا رہا تھا۔[7] (اور جہاں تک اس آپس کی لڑائی کا تعلق ہے تو) صحیح حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے پروردگار سے استدعاء کی کہ وہ آپؐ کی امت کو قحطِ عام سے ہلاک نہ کرے تو آپؐ کی یہ استدعاء قبول ہوئی۔ پھر آپؐ نے استدعاء کی کہ وہ اِن پر باہر سے کوئی دشمن مسلط نہ کردے (جو ان کا بیج مار دے) تو یہ قبول ہوئی۔ پھر آپؐ نے استدعاء فرمائی کہ وہ اِن کے آپس میں جنگ نہ ہونے دے، تو یہ قبول نہ ہوئی۔ آپ ﷺ نے خبر دی کہ اللہ اِن پر باہر سے کوئی دشمن مسلط نہ کرے گا جو اِن سب کو مغلوب کردے، یہاں تک کہ خود یہی ایک دوسرے کو قتل کرنے اور غلام بنانے لگیں۔ صحیحین میں آتا ہے، کہ جب قرآن کے الفاظ نازل ہوئے: ”کہو، وہ قادر ہے کہ عذاب بھیج دے تم پر تمہارے اوپر سے“ تو آپ ﷺ بولے: ”تیرے روئے اقدس کی پناہ“۔ پھر الفاظ آئے ”یا تمہارے پاؤں تلے سے“ تو آپ ﷺ گویا ہوئے ”تیرے روئے اقدس

---

[6] ہمارے اسلامی ہیومنسٹوں نے تو سنا تھا سب سے محبت ہی کی جاتی ہے! ادھر بتایا جارہا ہے کہ مسلمان کے ساتھ لڑائی بھی ہو جائے تو اس کے ساتھ وہ دشمنی نہیں رکھی جاتی جو کافر سے رکھی جاتی ہے!!!

[7] سلف کے آپس میں لڑائی کا معاملہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح گھر میں دو بھائیوں کے مابین لڑائی چھڑ جائے اور شیطان اس نادر موقع سے بھرپور فائدہ اٹھالے۔ باوجود اس کے کہ دونوں ایک ہی ”گھر“ ہوتے ہیں۔ یعنی ”ایک“ ہونے کا معنیٰ پھر بھی کسی درجے پر قائم ہے۔ اوپر ابن تیمیہ کے کلام میں ”الجماعۃ“ کا یہی معنیٰ واضح کیا گیا ہے۔ کیونکہ؛ آپس کی لڑائی بھڑائی ہو جانا بہر حال ایک انسانی واقعہ ہے۔ ایسی اشیاء مذموم اور ناگوار سہی، مگر پیش آسکتی ہیں۔ **اِس سے ”الجماعۃ“ کا معنیٰ متاثر ضرور ہوتا ہے مگر ختم نہیں ہو جاتا۔** پس ”الجماعۃ“ کا وہ معنیٰ سمجھنا اور عملاً قائم کر رکھنا ضروری ہوا جسے **باہمی تنازعات کے باوجود** نفوس پر حاوی رہنا اور آخر معاملے کو اس کی اصل پر واپس لانا ہوتا ہے۔ ”ایک گھر“ ہونے کا وہ معنیٰ جس میں لڑائیاں بھڑائیاں بھی ہو ہی جاتی ہیں؛ کیونکہ بہر حال یہاں فرشتے نہیں انسان بستے ہیں۔

کی پناہ‘‘۔ پھر الفاظ آئے ’’یا تمہیں گروہ گروہ کر دے اور ایک کو دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھادے‘‘ تو آپ ﷺ نے کہا: ’’یہ دونوں باتیں نرم تر ہیں‘‘۔ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ جماعت اور یکجہتی رکھی جائے، اور بدعت و اختلاف سے منع فرمایا۔ ارشادِ خداوندی ہے: ’’بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو فرقے کر لیا اور کئی کئی گروہ ہو گئے، تمہارا اُن سے کچھ تعلق نہیں‘‘۔ جبکہ ارشادِ نبوی ہے: ’’ایک جماعت بن کر رہو؛ بے شک اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے‘‘، نیز فرمایا: شیطان ایک اکیلے آدمی کے ساتھ ہے؛ دو سے وہ دور تر ہوتا ہے‘‘۔ نیز فرمایا: شیطان انسان کے حق میں بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کے لیے بھیڑیا ہوتا ہے؛ وہ ریوڑ میں سے دور ہٹی ہوئی یا الگ تھلگ رہی ہوئی بھیڑ کو اٹھاتا ہے‘‘۔ پس مسلمان پر واجب ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر میں ہو، تو ان کے ساتھ ہی جمعہ و جماعت ادا کرے؛ ان کے ساتھ بیر شروع نہ کر دے۔ اگر ان میں سے کسی کو گمراہ یا برگشتہ دیکھے، اور اس کو ہدایت اور بھلائی کے راستے پر چڑھالانا اس کے لیے ممکن ہو تو ضرور ایسا کرے، ورنہ اللہ کسی کو اس کی گنجائش سے بڑھ کر مکلف فرماتا ہی نہیں۔ اگر مسلمانوں پر ایک اچھا امام مقرر کرنے میں اس کی چلتی ہو تو ضرور ایک اچھا امام بنائے۔ اگر بدعات اور فسق و فجور کرنے والوں کو روکنے پر قدرت رکھتا ہو تو ضرور ایسا کرے۔ اور اگر اس کی چلتی نہیں تو (جو موجود ہے اس میں) جو شخص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا نسبتاً زیادہ علم رکھنے والا ہے اور اللہ اور رسول کی اطاعت میں باقیوں سے آگے ہے، اُس کے پیچھے نماز ادا کرنا افضل ہے...

> ایک بدعتی یا ایک فاسق فاجر کے ساتھ روکھا ہو کر دکھانا اگر مصلحتِ راجحہ کا تقاضا ہو تو ضرور ایسا کرے۔ (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج3 ص286، 285)

3- ’’جماعت‘‘ کا یہی معنیٰ، فقہی تنوع کی جہت سے:

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو مجتمع و یکجہت رہنے کا حکم دیا اور افتراق و اختلاف سے منع فرمایا۔۔

صحابہؓ آپس میں یکجہتی اور اتفاق قائم کرتے، اگرچہ وہ فروعِ شریعت مانند طہارت، نماز، حج، طلاق یا میراث وغیرہ کے (بہت سے مسائل) میں اختلاف بھی کر لیتے...

یہ ابو یوسفؒ اور محمدؒ ہیں، سب لوگوں سے بڑھ کر ابو حنیفہؒ کے پیچھے چلنے اور سب سے بڑھ کر اقوالِ ابو حنیفہ کو جاننے والے۔ مگر دونوں اتنے مسائل میں ابو حنیفہؒ کے خلاف گئے کہ شمار ممکن نہیں، اس لیے کہ ان کو سنت اور دلیل سے (اس کے برعکس) امور واجبِ اتباع نظر آئے۔ جبکہ امام کے لیے اُن کا احترام بدستور قائم تھا۔ یہ دونوں اس بنا پر متذبذب قرار نہیں دیے جائیں گے۔ خود ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ ایک قول اختیار کرتے ہیں اور پھر ان کو دلیل اس کے خلاف نظر آتی ہے تو وہ اُس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اِن کو بھی متذبذب نہیں کہیں گے۔ علم کی ایک بات آدمی سے پوشیدہ تھی پھر معلوم ہوئی تو وہ اس کا متبع ہو گیا، یہ متذبذب ہونا نہیں ہدایت یافتہ ہونا ہے؛ اللہ نے اس کو ہدایت میں بڑھا دیا ہے۔ خود اللہ نے فرمایا: ”کہو! اے پروردگار! مجھے علم میں بڑھا دے“۔ پس واجب ہے ہر مومن پر کہ وہ تمام مومنوں کے ساتھ اور مومنوں کے علماء کے ساتھ یکجہتی رکھے۔ حق کا متلاشی اور پیروکار رہے خواہ وہ اسے جہاں بھی پائے۔ جان رکھے کہ علماء میں سے جس نے اجتہاد کیا اور مقصودِ شریعت کو جا پایا اس کے لیے دہرا اجر ہے اور جس سے چوک ہوئی اس کے لیے اکہرا اجر، نیز اس کی چوک معاف ہے۔ مومنوں پر فرض ہے کہ (نماز میں) امام کے پیروی کریں جہاں اُسکا فعل گنجائش کے دائرہ میں ہو؛ اس لئے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: امام بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس کے پیچھے چلا جائے۔ خواہ امام رفع یدین کرے خواہ نہ کرے؛ اس سے مقتدیوں کی نماز کا کچھ نقصان نہ ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہے نہ شافعیؒ نہ مالکؓ اور نہ احمدؒ کے نزدیک۔ امام رفع یدین کرتا ہے مقتدی نہیں کرتا، یا مقتدی رفع یدین کرتا ہے امام نہیں کرتا؛ دونوں کی نماز کو اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ آدمی خود کبھی رفع یدین کر لے، کبھی نہ کرے، اس سے بھی اُس کی نماز کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی ایک عالم کے موقف کو ہر کسی سے منواتا اور اس کے خلاف چلنے سے لوگوں کو روکتا پھرے جبکہ وہ (دوسرا قول بھی) سنت میں آیا ہو۔ بلکہ سنت میں جو کچھ آیا، اس سب

کی گنجائش ہے۔ اذان اور اقامت کی مثال لے لیں۔ صحیحین میں نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دہری اور اقامت اکہری کہنے کا حکم فرمایا۔ جبکہ صحیحین میں ہی آپؐ سے ثابت ہے کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو اقامت اور اذان دونوں دہری کہنے کا حکم فرمایا۔ پس جو اقامت دہری کہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ اور جو اکہری کہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ البتہ جو ایک طریقے کو واجب اور دوسرے کو ممنوع ٹھہرائے وہ غلطی پر ہے اور گمراہ ہے۔ جو شخص ان میں سے ایک طریقے والے کے ساتھ تو اپنائیت اور دوستی رکھے مگر دوسرے طریقے والے کے ساتھ نہ رکھے وہ غلطی پر ہے اور گمراہ ہے۔ عالم اسلام کے مشرقی شہروں پر اللہ نے تاتاریوں کو مسلط کروایا تو اس کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ (فقہی) مذاہب کے معاملے میں ان کے مابین تفرقہ اور فتنے بہت بڑھ گئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک شافعی کو دیکھیں تو وہ اپنے مذہب کے لیے ابو حنیفہ کے مذہب خلاف تعصب میں اس قدر سخت کہ دین سے نکلنے تک چلا جائے۔ حنفی کو دیکھیں تو وہ اپنے مذہب کے لیے اور شافعی و دیگر ائمہ کے مذاہب کے خلاف تعصب میں دین سے نکلنے تک چلا جائے۔ حنبلی کو دیکھیں تو وہ اپنے مذہب کے لیے باقی مذاہب کے خلاف اتنا ہی متعصب۔ مراکش میں مالکی مذہب کا آدمی دیگر مذاہب کے خلاف ایسا ہی متعصب۔ یہ سب اُس تفرقہ اور اختلاف میں آتا ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول نے ممانعت فرمائی ہے۔ یہ سب باطل تعصب رکھنے والے، خدائی ہدایت سے تہی، اپنی اھواء کی پیروی کرنے والے لوگ مذمت اور سزا کے مستحق ہیں۔ یہ ایک وسیع باب ہے؛ اِس فتویٰ میں اس کی تفصیل کرنے کی گنجائش نہیں۔ غرض الجماعۃ کے ساتھ پختہ وابستگی اور یکجہتی رکھنا اصولِ دین میں آتا ہے۔ جبکہ وہ فرعی مسئلہ جس پر بحث ہو رہی ہے ایک فرع ہے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فرع کو بچاتے بچاتے آپ اصل کا نقصان کر دیں؟!

صحابہ اور تابعین وغیرہ سلف کا اتفاق رہا ہے کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھی جائے، باوجود اس کے کہ بعض فروعی مسائل میں ان کا اختلاف ہوا ہے۔ نماز کے بعض واجبات میں ان کا اختلاف ہوا ہے، نماز جن چیزوں سے ٹوٹ جاتی ہے، ان میں

سلف کا اختلاف ہوا ہے۔ جو شخص اجتہاد کے دائرے میں آنے والے امور کے باعث امت کے کسی ایک طبقے کو کسی دوسرے طبقے کے پیچھے نماز پڑھنے سے روکے وہ اہل بدعت و اہل ضلالت کی صنف سے ہے، جن کے بارے میں ارشاد ہوا: ”بے شک وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو فرقے کر لیا تمہارا ان سے کچھ تعلق نہیں“۔ نیز فرمایا: ”اور مضبوط تھام لو اللہ کی رسی کو ایک جماعت ہو کر اور تفرقہ مت کرو“۔ نیز فرمایا: ”اور مت ہو جاؤ اُن لوگوں کی طرح جو تفرقہ اور اختلاف میں پڑے بعد اس کے کہ ان کے پاس روشن نشانیاں آچکی تھیں“۔ نیز اسی طرح کی دیگر نصوصِ کتاب و سنت جن میں جماعت اور یکجہتی کا حکم ہوا ہے اور تفرقہ و اختلاف سے ممانعت۔
(مجموع الفتاویٰ ج5 ص273) نیز (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج 3 ص286 ،285)[8]

4۔ ”جماعت“ کا یہی معنیٰ نیشنلزم اور عصبیتوں کو رد کرنے کی جہت سے:

صحیح مسلم کی روایت میں، ارشادِ نبویؐ ہے: جو شخص جاہلی پرچم تلے (لڑتا) مارا گیا، جس نے کسی عصبیت کے لیے حمیت دکھائی، یا کسی عصبیت کے لیے آواز اٹھائی، وہ دوزخی ہے۔ مسند احمد کی روایت میں، آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اہل جاہلیت ایسی عصبیت کا نعرہ بلند کرے، اُسے کسی اشارے کنائے کی زبان استعمال کیے بغیر اُس کے باپ کے ننگ کی گالی دو۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کسی شخص کو نعرہ لگاتے ہوئے دیکھا ’فلاں (قوم) کی جے‘، تو فرمایا: اپنے باپ کی شرمگاہ کو جپتے ہو۔ وہ کہنے لگا: ابو المنذر! آپ تو کبھی فحش گو نہ تھے! حضرت ابیؓ نے فرمایا: یہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے (جو میں نے کیا)۔ جاہلی نعرہ بلند کرنا یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی قومی نسبت کا شور الاپے۔ مثلاً یمن کی جے۔ قیس (ایک قوم) کی جے۔ ہلال یا اسد کی جے۔ جو شخص عصبیت رکھے (مسلمانوں میں سے) خاص اپنے ملک کے لیے یا اپنے مسلک کے لیے یا اپنی طریقت کے لیے، یا اپنے رشتوں یا اپنے ساتھیوں کے لیے، تو ایسے شخص میں جاہلیت کا ایک شعبہ ضرور ہے۔

---

[8] مجموع فتاوی ابن تیمیہ کی عربی عبارتیں کتاب میں دی گئی ہیں، یہاں ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔

تا آنکہ مومنین ویسے نہ ہو جائیں جیسا اللہ کا حکم ہے: سب مل کر اللہ کی رسی کو تھامنے والے اُس کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت سے چمٹ جانے والے۔ کیوں نہ ہو: ان کی کتاب ایک، ان کا دین ایک، ان کا نبی ایک، ان کا رب ایک یکتا معبود؛ اُسی کی حمد دنیا میں اُسی کی آخرت میں، سب فیصلہ اُسی کے ہاتھ، اور لوٹنا ہے تو اُس ایک کی طرف۔ ارشادِ خداوندی ہے: ”اے ایمان والو ڈرو اللہ سے جیسے اُس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر مسلمانوں والی حالت میں۔ اور مضبوط تھام لو اللہ کی رسی کو ایک جماعت ہو کر اور تفرقہ نہ کرو، اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت؛ کہ جب تم آپس میں دشمن تھے تو اُس نے تمہارے آپس میں دلوں کی الفت پیدا کر دی؛ اور پھر تم اُس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے، درحالیکہ تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر (جا پہنچے ہوئے) تھے۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ۔ اور لازم ہے کہ تم میں ایک جماعت ایسی ہو جو حق کی داعی بنے، معروف کا حکم دینے والی اور منکر سے روکنے والی؛ اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔ اور مت ہونا اُن لوگوں کی طرح جنہوں نے تفرقہ اور اختلاف کیا بعد اس کے کہ اُن کے پاس روشن دلائل آ چکے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے ایک بڑا عذاب ہے۔ وہ دن جب کچھ چہرے روشن ہوں گے تو کچھ چہرے کالک زدہ“۔ یہاں ابن عباسؓ نے تفسیر فرمائی: روشن چہرے اہل سنت و جماعت کے۔ اور کالک زدہ چہرے اہل تفرقہ و بدعت کے۔ پس اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، آپس میں جماعت اور یکجہتی پیدا کرو اللہ اور رسول کی اطاعت پر اور اللہ کے راستے میں جہاد پر۔ (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج11 ص92-94)

اِس دوسرے مفہوم کا لب لباب:

غرض کافروں سے علیحدگی اور مسلمانوں کے ساتھ شمولیت پر مبنی ایک بھرپور گرمجوش سماجی زندگی اور سیاسی وحدت۔ کرۂ ارض پر مسلمانوں کا ایک جماعت اور قوت ہونا۔ باہمی یکجہتی و ہم آہنگی۔ شرعِ محمدی پر قائم خدا کے عبادت گزاروں کا ایک الگ تھلگ خودمختار کیمپ۔ مسلمانوں کا باہمی استحکام؛ مقامی سے لے کر عالمی سطح تک۔

اِس معنیٰ میں بھی **امت کا نجات پانے والا گروہ** ''اہل الجماعۃ'' ہے۔ یعنی یہ طائفہ 'حق' صرف 'انفرادی' معنیٰ میں ہی شریعت وسنت کی پیروی پر یقین نہیں رکھتا؛ جیسا کہ اِس وقت ہمیں 'پڑھانے' کی سر توڑ کوشش ہو رہی ہے۔ بلکہ یہ اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ اِس **شریعت وسنت کے پیروکار زمین پر ایک مضبوط جتھہ اور عالمِ انسانی کا ایک مستحکم کیمپ** ہوں۔ یعنی روئے زمین پر اتباعِ حق کے عمل کو اُس سطح تک جانا ہے جہاں خود معاشرہ ہی ''خدا کے نازل کردہ'' کا پابند اور اس کی حرمت وحقانیت پر یک آواز ہو۔ اتباعِ حق کی اصل سطح ہے بھی یہی؛ کیونکہ جہاں حق کو ایک **مستحکم کیمپ** دستیاب نہ ہو اور حق وہاں کی **فضاؤں پر ہی حاوی** نہ ہو، وہاں 'فرد' بیچارے کی نماز اور حیاء بھی کسی ایک آدھ نسل تک ہی چل پائے گی؛ اور کسی ایک آدھ 'ثقافتی ریلے' کی مار ہو گی۔ اس لیے ''سنت'' بغیر ''جماعت'' اور ''جماعت'' بغیر ''سنت'' نرا فلسفہ ہیں۔ لا إسلام إلا بجماعة۔ یہاں سے بنا ''اہل السنۃ والجماعۃ''؛ جو کہ ایک کامل اسلامی عمل کا آئینہ دار ہے؛ ایک جیتا جاگتا اسلام؛ جو نئی آنے والی نسلوں کو آنکھ کھولتے ہی اپنے چاروں طرف چلتا پھرتا اور معاشرتی رویوں پر چھایا ہوا ملے۔ خود یہ ''سنت'' جو پوری انسانی زندگی اور پورے انسانی معاشرے کو خدائی ڈھب پر لانے کا نام ہے، زمین پر اپنی مرضی کا ایک مستحکم کیمپ (الجماعۃ) رکھے بغیر، سکڑتے سکڑتے، طہارت اور وضوء ایسے چند مسائل میں محصور ہو کر رہ جائے گی اور آپ ایسے ہی چند مسائل میں ''سنت'' پر عمل پیرا کر اپنے آپ کو ''سرخرو'' جاننے لگیں گے! اہل الجماعۃ ہوئے بغیر اہل السنۃ ہونا کسی وہمی دنیا میں رہنے کے مترادف ہو گا۔

تیسرا مفہوم:

''الجماعۃ'' کا ایک مفہوم اس کا ریاست ہونا ہے۔ گزشتہ فصل میں مذکور حدیثِ حذیفہؓ میں جہاں کہا گیا فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَلاَ إِمَامٌ؟ ''اگر مسلمانوں کی جماعت اور امام نہ ہو؟'' تو اس کا یہی اطلاق بنتا ہے۔ کیونکہ؛ اگر ''الجماعۃ'' سے مراد محض ابدان کا پایا جانا ہو تو یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مسلمان زمین پر قیامت تک چلتے پھرتے پائے جائیں گے لہٰذا کوئی

ضرورت نہیں رہتی کہ حذیفہؓ نبیﷺ سے باقاعدہ سوال کریں کہ اگر اُس دور میں جماعۃ المسلمین (بمعنیٰ مسلم اَبدان) نہ ہوں تو وہ کیا کریں؟! لامحالہ یہاں ”جماعۃ المسلمین“ سے مراد مسلمانوں کا نظم ہے۔ جس کی غیر موجودگی میں دوزخی دستوروں پر قائم ٹکڑیوں سے دور رہنے کا حکم ہے؛ خواہ آدمی کو ”درخت کی جڑیں کیوں نہ چبانی پڑیں اور اسی حالت میں موت کیوں نہ آجائے“۔ [ii] تصور کریجئے، جماعۃ المسلمین کے لیے اُس کا اپنا نظم ہونے کی اہمیت۔ اِس سے بڑھ کر قوی تعبیر بھلا کیا ہو سکتی ہے۔

درج ذیل مضمون کی احادیث بھی ”الجماعۃ“ کے اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہیں؛ اور جو کہ بڑی تعداد میں مروی ہیں:

«مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَصْبِرْ عَلَيْهِ فَإِنَّهُ مَنْ فَارَقَ الجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ، إِلَّا مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً» (البخاری رقم 7054)

> ”جو آدمی اپنے امیر سے کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اس پر صبر کرے؛ کیونکہ جس نے الجماعۃ سے بالشت بھر مفارقت کی اور اسی حال میں مرا، وہ جاہلیت کی موت مرا“۔

* * * * *

اوپر جو معانی گزرے، ان کا خلاصہ کریں تو:

- ”الجماعۃ“ ایک تو خود اُس عمل کو کہیں گے جو اہل اسلام کے [دیگر انسانی جماعتوں سے علیحدہ؛ اور آپس میں مجتمع و ہم آہنگ ہونے اور روئے زمین پر ایک مضبوط انسانی بلاک بن کر رہنے] سے عبارت ہے۔ اِس کے تحت دوسرا مفہوم آجاتا ہے۔
- دوسرا، وہ محور جس کے گرد ”مجتمع ہونے“ کا یہ عمل انجام پائے گا؛ اور جس کے بغیر یہ کوئی اکٹھ برائے اکٹھ قسم کی چیز ہو کر رہ جائے گا؛ جو کہ دوسری انسانی جماعتوں کے حق میں بے شک درست ہے؛ مگر اِس کے حق میں نہیں۔ اس کے تحت اوپر مذکور پہلا مفہوم آجاتا ہے۔
- تیسرا، اس کا نظم۔ یعنی ایک امارت کے تحت ہونا۔

* * * * *

---

[i] حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ... إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثٍ: الثَّيِّبُ الزَّانِي، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالتَّارِكُ لِدِينِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ (متفق عليه، واللفظ لمسلم، رقم 1676)

مسلمان آدمی... کا خون حرام ہے، سوائے تین گناہوں سے: شادی شدہ زانی، جان کے بدلے جان، اور وہ جو اپنے دین کا تارک اور جماعت کا مفارق ہو گیا ہو۔

سوال یہ ہے کہ اگر اِن کا صحیح ’شرعی‘ سٹیٹس بکھرے پتنگے ہونا ہی تھا تو اِنہیں چھوڑ جانے والے کو ”مفارقِ جماعت“ کیوں کہا گیا؟ اس کے لیے تو، مرتد ہو جانے کی صورت میں، تارکِ دین (’مذہب‘ چھوڑ جانے والا) کہہ دینا بہت کافی تھا! معلوم ہوا، یہاں کوئی چیز تھی جس کا نام ”مسلمانوں کی جماعت“ ہے، اور جس کو ”لازم پکڑ رکھنے“ کی شریعت میں جگہ جگہ تاکیدیں ہیں؛ اور اتنی زیادہ نصوص کہ ”الجماعۃ“ کا پورا ایک مفہوم ابھر کر سامنے آتا ہے۔

[ii] حدیث کا متن یوں ہے:

قُلْتُ: فَهَلْ بَعْدَ ذَلِكَ الخَيْرِ مِنْ شَرٍّ؟ قَالَ: نَعَمْ، دُعَاةٌ إِلَى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوهُ فِيهَا قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، صِفْهُمْ لَنَا؟ فَقَالَ: هُمْ مِنْ جِلْدَتِنَا، وَيَتَكَلَّمُونَ بِأَلْسِنَتِنَا قُلْتُ: فَمَا تَأْمُرُنِي إِنْ أَدْرَكَنِي ذَلِكَ؟ قَالَ: تَلْزَمُ جَمَاعَةَ المُسْلِمِينَ وَإِمَامَهُمْ، قُلْتُ: فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَلاَ إِمَامٌ؟ قَالَ: فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الفِرَقَ كُلَّهَا، وَلَوْ أَنْ تَعَضَّ بِأَصْلِ شَجَرَةٍ، حَتَّى يُدْرِكَكَ المَوْتُ وَأَنْتَ عَلَى ذَلِك (متفق عليه۔ بخاری رقم 3606، مسلم رقم 1847)

میں نے عرض کی: تو کیا اُس خیر کے بعد کوئی شر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ دوزخ کے دروازوں پر آوازیں لگانے والے، جس نے ان کی مانی وہ اُن کے ہاتھوں دوزخ میں جا پڑے گا۔ میں نے عرض کی: ہمیں ان کی کچھ نشانی بیان فرما دیجئے۔ کہا: وہ ہماری چمڑی سے ہوں گے، ہماری زبان بولتے ہوں گے۔ میں نے عرض کی: تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں اگر میں وہ وقت پا لوں؟ فرمایا: مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے وابستہ رہنا۔ میں نے عرض کی: تو اگر مسلمانوں کی جماعت اور ان کا امام نہ ہو؟ فرمایا: تو پھر ان سب ٹولوں سے ضرور دور رہنا خواہ تمہیں درخت کی جڑیں کیوں نہ چبانی پڑیں یہاں تک کہ اسی حال میں تمہیں موت آ جائے۔